© rasailojaraid.com

مولانا شہاب الدین ندوی

اسلامی تہذیب اور تمدن کو کیونکر ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟

ـــــ آخری قسط ـــــ

علامہ اسد مسلمانوں کی موجودہ پس ماندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ جہاں تک سائنسی تحقیق کا تعلق ہے ہماری مدت العمر کی غفلت اور لاپروائی نے ہمیں بالکل یورپ کے پیش کیے ہوئے علوم کا دست نگر بنا دیا ہے۔ اگر ہم اسلام کے اصول پر ہمیشہ قائم رہے ہوتے جو ہر مسلمان پر علم حاصل کرنے اور تحقیق کرنے کا فریضہ عائد کرتا ہے تو آج ہمیں جدید علوم کے لیے یورپ کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہ ہوتی، جیسے کسی صحرا میں کوئی پیاسا افق کی طرف سراب کو دیکھتا ہے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں نے مدتوں تک خود اپنے امکانات سے غفلت برتی اس لیے وہ جہالت اور مادی افلاس میں مبتلا ہو گئے، اور یورپ نے آگے کی طرف لمبا قدم بڑھا دیا۔ اس خلیج کو پر ہونے میں مدتیں لگ جائیں گی۔ اس وقت قدرتاً ہمیں جدید علوم کو یورپ کے تعلیمی وسیلے سے حاصل کرنا ہوگا۔ لیکن اس کا مطلب اتنا ہی ہے کہ ہمیں صرف سائنسی مواد اور طریقے لینا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں[1]

پھر وہ اسلام کی تہذیبی برتری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہمیں پختہ یقین ہے اور مغرب کے حالیہ واقعات سے اس کی توثیق ہوتی ہے کہ اسلامی اخلاقیات، اس کا سماجی اور شخصی اخلاق کا تصور، اس کا انصاف اور اس کی حریت پسندی اس کے مقابلے کے یورپی تہذیب کے تصورات سے بہت زیادہ

---

[1] کتاب مذکور کا اردو ترجمہ "اسلام دوراہے پر" از رحم علی الہاشمی، ص ۶۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارفع اور بہت زیادہ مکمل ہیں۔ اسلام نے نسلی امتیاز کو ختم کر دیا اور انسانی مساوات و مواخات کا راستہ صاف کر دیا لیکن یورپی تہذیب اب تک نسلی اور قومی عداوتوں کے تنگ دائرے کے باہر نظر ڈالنے سے قاصر ہے۔ اسلام نے کبھی اپنے سماج میں طبقاتی امتیازات اور طبقاتی جنگ کو روا نہیں رکھا۔ لیکن یورپ کی ساری تاریخ یونان اور روما کے زمانے سے لے کر آج تک طبقاتی کشمکش اور سماجی نفرت سے بھری پڑی ہے۔[۵۲]

آگے وہ موجودہ دور میں اسلامی نظام حیات کے احیا کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

کہ ہمیں غیروں کی تہذیب سے کچھ مستعار لینے یا ان میں جذب ہونے کے بجائے نہایت درجہ خود اعتمادی کے ساتھ دیگر تہذیبوں (یا تمدنوں) کے بہتر اور اچھے اثرات کو اپنی تہذیب کے سانچے میں ڈھال لینا چاہیے، اس طور پر کہ ہمارا اپنے ماضی سے رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔

"اسلام کے احیا کا مقصد حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو تمام اصلاحی تدابیر سے پہلے خود اپنے مذہب کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ قطعاً ترک کر دینا چاہیے۔ مسلمان کو اپنا سر بلند کر کے رہنا چاہیے۔ اور اُسے یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ دنیا میں سب سے الگ اور ممتاز ہے۔۔۔ اپنی تہذیب کو مٹائے بغیر یہ ممکن ہے کہ ہم ہمیشہ کسی اجنبی تہذیب سے آنے والے جدید مثبت اثرات کو قبول کریں۔ اس قسم کی بہترین مثال یورپ کی نشأۃ ثانیہ ہے۔ اس میں ہم نے دیکھ لیا کہ کس مستعدی کے ساتھ علوم اور حصول علم کے طریقوں میں عرب کا اثر قبول کر لیا گیا۔ لیکن اس نے کبھی عرب تہذیب کی اسپرٹ اور ظاہری شکل و صورت کی نقل نہیں کی اور نہ ہی اپنی ذہنی اور جمالیاتی آزادی کو قربان کیا۔ اس نے عرب کے اثرات کو خود ہی اپنی زمین پر کھاد کے طور پر استعمال کیا، اسی طرح جیسے عربوں نے اپنے وقت میں یونانی اثرات سے کام لیا تھا۔ دونوں صورتوں میں ایک خود ان کی ملکی تہذیب کی طاقت ور اور نئی تشکیل ظہور میں آئی جو خود اعتمادی اور افتخار سے معمور تھی۔ کوئی تہذیب جو اس افتخار کو ترک کر دے اور اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لے نہ فروغ پا سکتی ہے اور نہ ہی زندہ رہ سکتی ہے۔"[۵۳]

کتاب کے خاتمے میں وہ تحریر کرتے ہیں:

---

۵۲ ایضاً، ص ۶۹

۵۳ ایضاً، ص ۷۳، ۷۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی تمدن اور تہذیبیں (جانداروں کی طرح) نامیاتی اجسام ہیں، جو پیدا ہوتی ہیں، جوان ہوتی ہیں اور بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ تو کیا اسلام کی بھی یہی صورت ہے؟ پہلی سرسری نظر میں تو ایسا ہی معلوم ہوگا۔ مگر اسلام محض دیگر تہذیبوں کی طرح ایک تہذیب نہیں ہے۔ بلکہ ایک خدائے برتر و اعلیٰ کا دیا ہوا قانون ہے، جس کی پابندی نوعِ انسان کو ہر جگہ اور ہر زمانے میں لازم ہے۔"[۴]

اسلامی تمدن کے عناصر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اسلامی تمدن یا اس کی تہذیبی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے نیز انسان کی عقلیت و نفسیت اور اس کے اخلاق و اجتماع پر پڑنے والے اسلامی تمدن کے انقلاب انگیز اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"سب سے پہلے وہ اس عالم کے متعلق یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ نہ کوئی بے بادشاہ کی سلطنت ہے، نہ چند بادشاہوں کی مشترک سلطنت ہے۔ بلکہ اس کا ایک ہی مالک ہے جو اس کا خالق و صانع بھی ہے اور اس کا منتظم و حاکم بھی۔ خلقت بھی اس کی ہے، ملک بھی اس کی ہے، ملک بھی اس کا ہے اور حکم بھی اسی کا۔ (اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ) اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کی قدرت سے ہوتا ہے۔ حقیقی علت اس کا ارادہ اور اس کی قدرت ہے۔ یہ ساری کائنات تکوینی طور پر (جس کا تعلق عالم کے نظم و نسق سے ہے) اس کے سامنے سرافگندہ اور اس کے احکام کی مطیع ہے۔ (وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) پس وہ مخلوقات جو صاحب ارادہ و اختیار ہیں، ان کو بھی اس کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے۔ (اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ)۔

"اس کا سب سے پہلا ذہنی اثر یہ پڑتا ہے کہ سارے عالم میں ایک مرکزیت و تنظیم (بظاہر) منتشر اجزائے عالم میں ایک ربط اور قانون میں ایک وحدت نظر آنے لگی ہے، اور انسان زندگی کی مکمل توجیہ کر سکتا ہے، اور اس کا فکر اور رویہ اس کائنات کے بارے میں حکمت و بصیرت پر مبنی ہوتا ہے۔

"اخلاق و عمل پر اس کا اثر اس سے زیادہ اہم اور انقلاب انگیز ہے۔ اس کے دل و دماغ سے اپنی خود مختاری

---

[۴] ایضاً، ص ۱۰۳-۱۰۴ (ملخص)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اللہ کی اس سلطنت میں حکومت خود اختیاری کا جذبہ اور خیال (جو شر و فساد، نزاع و تصادم کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے) نکل جاتا ہے۔ وہ اس زمین کے باشندوں کو، دولت کے خزانوں کو اور خود اپنی طاقتوں اور اپنے جسم و اعضا کو اپنی مِلک نہیں سمجھتا ہے۔ بلکہ خدا کی امانت سمجھتا ہے اور اس کی اجازت اور اس کے قانون کے خلاف ان کے استعمال اور ان میں تصرف کرنے سے ڈرتا ہے۔ وہ اپنے سے ایک بلند و بالا طاقت کے مقابلے میں اپنے کو محکوم اور ایک بڑی عدالت کے سامنے اپنے کو جواب دہ سمجھتا ہے۔"[۵۵]

"عقلی تمدن و فلسفے کے دور میں اکثر قوم اور سوسائٹی پر سوفسطائیت طاری ہو جاتی ہے۔ حقائق اشیا کا اور اخلاق و صفات کے باہمی فرق کا انکار کیا جانے لگتا ہے۔ اخلاق و صفات، حسن و قبح محض اعتباری اور نسبتی شے سمجھی جانے لگتی ہے، جو زمان و مکان کے اختلاف سے بدلتی رہتی ہے۔ یہ ذہنی کیفیت سخت اخلاقی انحلال اور اجتماعی اختلال پیدا کر دیتی ہے، اور جب کسی قوم کی زندگی میں یہ دور آجاتا ہے تو پھر اس کو تباہی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

"یونان قدیم میں اس کی قومی بربادی کے وقت یہی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ایران قدیم میں اس نے اباحیت (ہر چیز کو جائز سمجھنا) کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور پورا نظام تمدن و معاشرت زیر و زبر کر دیا۔ روم کے مؤرخین اسی کا شکوہ کرتے ہیں، اور آج یورپ میں بعینہٖ یہی کیفیت موجود ہے اور وہاں کے منکرین اور اصلاح پسند اشخاص عرصے سے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ مگر اس کا علاج کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس کی روک تھام صرف نبوت کی تعلیمات اور محفوظ مذاہب کر سکتے ہیں، جو اخلاق کا فیصلہ اور حسن و قبح کا معیار عقل یا تجربے پر نہیں چھوڑتے بلکہ ان کو خود طے کر دیتے ہیں اور ان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔"[۵۶]

خیرِ امت کا سب سے بڑا وصف اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ

یہ ہیں اس مسئلے کے کچھ مظاہر اور اس کی جھلکیاں اور یہ ہے اس کے نشیب و فراز کا ایک جائزہ۔ ملتِ اسلامیہ کی تشکیلِ نو اور تعمیرِ جدید اس وقت زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے، اور اس سے بھی زیادہ اہم تر

---

۵۵ مذہب و تمدن، ص ۹۲-۹۴ — مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء

۵۶ ایضاً، ص ۱۰۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصلاحِ عالم کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اب ہم کو "کرو یا مرو"[1] کے مطابق یا تو کچھ کرکے دکھانا ہے یا پھر کسی دوسری قوم کے لیے راستہ خالی کردینا ہے (وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ) گویا ہم میدانِ خلافت سے فرار ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم اس کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں گے، اور ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ ہم اس قدر سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے دین کے تقاضوں کو پس پشت ڈال دیں اور اس کے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہوجائیں۔ یہ گویا ہماری ملی موت کے مترادف تو ہوگا ہی مگر خدا کے نزدیک بھی ہمارا یہ فعل ناقابلِ معافی جرم ہوگا۔ لہٰذا دین وعقل کا تقاضا ہے کہ ہم زندہ اور بہادر قوموں کی طرح اس میدان میں آگے بڑھیں۔ مگر یہ خلافتِ ارض کوئی کھیل تماشا نہیں ہے، اس میں بہت سے خطرات ہیں اور بہت سی ذمے داریاں ہیں۔ معاملہ ایسا ہے کہ اس سے ذرا بھی غفلت نہیں برتی جاسکتی۔ اقوامِ عالم میں اس وقت امتِ مسلمہ ہی وہ واحد ملت ہے جو خلافتِ ارض کی حامل ہے۔ لہٰذا وہی موجودہ گھٹاٹوپ تاریکیوں میں امید اور روشنی کی کرن دکھائی پڑتی ہے، اور اسی کی تشکیلِ نو اور تنظیمِ نو پر اقوامِ عالم کی صلاح وفلاح کا مدار ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران، ۱۰۴)

اور تم میں ایک ایسی جماعت (ضرور) ہونی چاہیے جو (لوگوں کو) خیر کی طرف بلائے اور (انھیں) معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران، ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو تمام لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے۔ (تمھارا منصب یہ ہے کہ) تم انھیں معروف کا حکم کرتے رہو اور منکر سے روکتے رہو۔

ان دونوں آیتوں کا مفہوم الگ الگ ہے۔ پہلی آیت ملتِ اسلامیہ کے ساتھ مخصوص ہے جب کہ دوسری آیت پوری نوعِ انسانی سے متعلق ہے۔ اس لحاظ سے پہلی آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ تم میں ایک ایسی جماعت ضرور ہونی

۱؎ DO OR DIE انگریزی کی ایک ضرب المثل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہیے جو ہر قسم کے دینی و شرعی معاملات میں تمھاری رہنمائی کرے[۵۸] اور تمھارے تمام ملی و اجتماعی مسائل حل کرے۔ اس مخصوص جماعت کی حیثیت پوری ملت اسلامیہ کے درمیان ایک نگرانِ اعلیٰ اور شاہد کی سی ہوگی جیسا کہ "و لتکن منکم" کے الفاظ تقاضا کر رہے ہیں، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ اس کا عقلی و منطقی تقاضا ہے کہ ایسی جماعت کو دینی و دنیوی تمام مسائل پر عبور ہونا چاہیے تاکہ وہ ملت کی صحیح صحیح رہنمائی کر سکے۔ اس کی مزید تفصیل اگلے باب میں آئے گی۔

اور دوسری آیت کریمہ کا تعلق خصوصیت کے ساتھ نوع انسانی سے ہے جیسا کہ اس کے الفاظ اور اس کے سیاق وسباق سے ظاہر ہو رہا ہے[۵۹]۔ اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ عالم انسانی کا "خیر" صرف دنیائے اسلام ہی سے وابستہ ہو سکتا ہے اور وہی اُمتِ خیر ہونے کی حیثیت سے نوع انسانی کی صلاح و فلاح کی ذمہ دار ہے کہ دعوت و تبلیغ کے صحیح اصولوں سے کام لے کر اور ہر ممکن طریقے اپنا کر یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ مذکور ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ط (نحل: ۱۲۵)

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت و دانائی اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور ان کے ساتھ بہترین

---

۵۸ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "خیر" سے مراد اتباع قرآن وسنت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، ۱/ ۳۹۰) اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں کہ "خیر کی اس سے جامع اور مانع تعریف نہیں ہو سکتی۔ پورا دین شریعت اس میں آگیا" (تفسیر معارف القرآن، ۲/ ۱۴۰)

۵۹ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک قرآن کریم کے ارشادات و خطابات خاص خاص احوال و کوائف کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہوتے بلکہ ان کا خطاب عام ہوتا ہے، سوائے چند مقامات کے۔ لہذا ان خطابات کو وسیع احوال و کوائف پر منطبق کرنا چاہیے۔ (مفہوم و ملخص)۔ شاہ صاحب کے خاص الفاظ یہ ہیں: "والاخری ان یعلم ان اکثر اسباب النزول لا مدخل لها فی فهم معانی الآیات، اللهم الا شئ قلیل من القصص" (الفوز الکبیر، ص ۲۵، المکتبۃ السلفیہ، لاہور، ۱۳۷۱ھ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طریقے سے مباحثہ کرو۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی امت مسلمہ کی دائمی صفت ہوگی۔ یہ کوئی وقتی اور موقت فریضہ نہیں ہے۔ جیسا کہ "یامرون" اور "ینھون" کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں۔ یہاں پر یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ تم یہ کام کرو۔ بلکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ خیر امت ہونے کی صفت ہی یہ ہے کہ وہ یہ سب کام کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا آج ہم پر جو بھی بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوئی ہیں وہ اپنے اس وصف اور فریضے کو ترک کرنے کی بدولت ہیں۔

معروف کے لغوی معنی ہیں "جانا پہچانا" اور منکر کے لغوی معنی ہیں "غیر جانا پہچانا"۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔" معروف ہر وہ فعل ہے جس کو عقل یا شرع بہتر سمجھیں اور منکر وہ ہے جس کو یہ دونوں برا جانیں" ؀

مفسرین کی تصریح کے مطابق معروف میں وہ تمام احکام آجاتے ہیں جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا رکھا ہے اور منکر میں وہ تمام "منہیات" داخل ہوجاتے ہیں جن سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس طرح معروف و منکر میں پورا دین اور پوری شریعت آجاتی ہے اور تمدنی و اجتماعی امور و معاملات بھی دین و شریعت سے الگ نہیں ہیں بلکہ انہی کے ضمیمے اور لاحقے ہیں جو دین و شریعت کے دائرے میں اور ان ہی کی حفاظت کی خاطر ہیں۔ اس طرح اسلام میں ہر چیز کے حدود و ضوابط واضح ہیں اور ہر چیز کا ایک مخصوص مقام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پورے دینِ اسلام کی روح معروف اور منکر میں سمیٹ دی گئی ہے اور سارا دین ان ہی دو امور کے گرد گھومتا نظر آرہا ہے۔ جس نے معروف و منکر کی صحیح حقیقت کو سمجھ لیا، اس نے گویا کہ دینِ الٰہی کے رمز کو پالیا۔ ہماری پوری زندگی کو — خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی — معروف کے مطابق ڈھلتے رہنا چاہیے اور اس میں خیر کا پہلو نمایاں ہونا چاہیے۔ اس میں دین و شریعت، تہذیب و ثقافت اور تمدن و اجتماع سب کچھ آجاتے ہیں، اور جو تمدن معروف کے دائرے سے ہٹ کر منکر کے حدود میں داخل ہوجاتا ہے تو وہ مضر اور نقصان دہ ہوگا اور اس کا رد کیا جانا ضروری ہوگا۔ جصاص رازی فرماتے ہیں کہ

؀ المفردات فی غریب القرآن۔ ص ۳۳۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دنیا میں جتنے بھی فتنے فسادات اور شرور و آفات پیدا ہوتے ہیں وہ سب منکر کے (ظہور کے) باعث ہوتے ہیں۔[۵۵]

موجودہ دور میں معروف و منکر کی صحیح ادائیگی ہی کے باعث اسلامی اور انسانی معاشروں کی اصلاح عمل میں آسکتی ہے، اور اس سلسلے میں حکمت و دانش اور دعوت و تبلیغ کے تمام اصولوں کو کام میں لانا اور انسانی نفسیات کے مطابق ترغیب و ترہیب (رغبت اور خوف دلانے) کے تمام طریقوں کو آزمانا ضروری ہے۔ قرآن اور حدیث کے مطالعے سے یہ حقیقت ہم پر بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی نفسیات کے مطابق دین و شریعت میں ترغیب و ترہیب یا انذار و تبشیر کے دونوں طریقوں سے خوب کام لیا گیا ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم دعوت و تبلیغ کی راہ میں ان اصولوں کو رہنما بنائیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو "معروف" جو کہ اوامر دین کا مجموعہ ہے پورے کا پورا ترغیب ہے اور "منکر" جو کہ نواہی کے مجموعے کا نام ہے پورے کا پورا ترہیب ہے۔ اس طرح پورا دین و شریعت اور اس کا سارا تمدن و اجتماع ایک حیثیت سے معروف و منکر کے گرد گھوم رہا ہے تو دوسری حیثیت سے وہ ترغیب و ترہیب کے گرد گردش کر رہا ہے۔ انسان فطرتاً نفع کی طرف لپکتا اور نقصان سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا پورا اسلام انسان کی اس بنیادی فطرت کے مطابق محض دو لفظوں کے درمیان گھوم رہا ہے۔ یہ فطرت و شریعت کی مکمل ہم آہنگی کی بھی دلیل ہے۔ نیز اس بات کی بھی ناقابل تردید شہادت کہ شریعت اسلامی کا مُرتِب و مُدوِّن اور قانون ساز اصلاً وہی ذاتِ گرامی ہے جس نے خود انسان کی تخلیق کی ہے، ورنہ قانونِ شریعت انسان کی فطرت کے مطابق ہرگز نہ ہوتا اور ہر دور میں اس کی قامت پر پورا نہ اُترتا۔

"حقوق العباد" کے سلسلے میں سوسائٹی کے افراد کے درمیان بعض اوقات جو زیادتیاں ہوتی ہیں، ان کی روک تھام کے لیے کبھی ترغیب سے اور کبھی ترہیب سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ یعنی کبھی سمجھا بجھا کر اور راضی کر کے اور کبھی ذرا دھمکا کر۔ مگر کبھی کبھی امن قائم کرنے اور معاملے پر قابو پانے کے لیے قوت اور زور آزمائی کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ کیونکہ بعض جھگڑالو مزاج آدمی صلح صفائی کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہی اصول بین الاقوامی حالات و معاملات میں بھی پیش آتا

---

[۵۵] احکام القرآن، ۲/۳۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہتا ہے۔ لہٰذا ملتِ اسلامیہ کے لیے —— جس کا فریضہ منکرات کی روک تھام ہے —— ضروری ہے کہ ایسے معاملات سے نپٹنے اور دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے قوت و شوکت حاصل کرے۔

ایک دوسری حیثیت سے غور فرمایئے تو موجودہ دور کی یہ سب سے بڑی نفسیاتی حقیقت بخوبی ظاہر ہو جائے گی کہ دنیا کی قومیں مادی علوم میں جس کو اپنا "امام" تسلیم کر لیتی ہیں وہ ذہنی و نفسیاتی اعتبار سے اپنے دیگر تمام تہذیبی و تمدنی معاملات میں بھی اسی کو "امامت" کے منصب پر فائز سمجھنے لگ جاتی ہیں۔ جیسا کہ آج علمائے اسلام کے مقابلے میں علمی دنیا پر مستشرقین کی دھاک بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور ان "اولوا الالباب" کے "اقوال" کے مقابلے میں علمائے اسلام کی "باتوں" کو کوئی نہیں سنتا اور ان پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ یا زیادہ واضح الفاظ میں ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ گویا کہ وہ بالکل بے وقعت اور بے وقار ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے نزدیک اصل معیار مادی شان و شوکت کا ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے کسی چیز کے ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں۔ اگر ظاہر خراب ہے تو سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن بھی خراب ہوگا۔

جو حال موجودہ ترقی یافتہ قوموں کا آج ہے وہی حال قرونِ وسطیٰ میں خود مسلمانوں کا بھی رہ چکا ہے۔ جب کہ اہلِ اسلام اپنے باطن کے ساتھ ساتھ ظاہری حیثیت سے بھی ممتاز تھے، تو اس وقت دوسری قومیں ان کے "اقوال" کو سند کا درجہ دیتی تھیں اور ان کے اقوال سے استدلال کرنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ یہ مقام جب تک پھر دوبارہ پیدا نہیں ہوتا امتِ مسلمہ صحیح معنی میں کوئی معزز مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

غرض جب تک موجودہ صورتِ حال معکوس نہیں ہوتی ہم اقوامِ عالم کو معروف اور منکر کے اسباق ٹھیک ٹھیک نہیں پڑھا سکتے اور معروف و منکر ہر دور اور ہر معاشرے میں مختلف نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ موجودہ دور کے منکرات میں جوا، لاٹری، سٹہ بازی، سودی کاروبار، فحش فلمیں اور ٹیلی ویژن[12]، فحش لٹریچر، ننگے کلب اور مختلف قسم کے انسانیت سوز اور مخربِ اخلاق رجحانات نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر دورِ جدید کا سب

---

[12] فلم اور ٹیلی ویژن بذاتِ خود کوئی بری چیز نہیں ہے مگر اس کا استعمال برا ہے۔ یہی حال ریڈیو وغیرہ کا بھی ہے۔ اگر ان چیزوں کو گانے بجانے اور اخلاق سوز محرکات و رجحانات سے پاک کر کے تعلیمی اور اصلاحی مقاصد میں استعمال کیا جائے تو اس سے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔ تفریح کے نام پر انسانیت سوزی اور تخریبِ اخلاق باعثِ تعجب ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بڑا منکر اس کے مہلک اور تباہ کن سائنسی ایجادات اور خطرناک قسم کے تمدنی و اجتماعی رجحانات ہیں جن میں خلائیات اور اجرام سماوی کی تسخیر بھی داخل ہے، جو بے جا اسراف و تبذیر کے ذیل میں آتی ہے۔ یہ اقدام محض چند جنگ باز انسانوں کی باہمی قومی و نسلی رقابت و کشمکش اور معرکہ آرائیوں کے نتیجے میں خلافتِ ارض کے تقاضوں سے گریز و فرار کو ظاہر کر رہا ہے اور یہ تمام خرابیاں موجودہ خودکشی کرتی ہوئی تہذیب کے تحفے اور مادیت و لادینیت اور خدا فراموشی کے عالم گیر نتائج ہیں۔

ان ہلاکت خیزیوں سے عالم انسانی کو بچانا بہت ضروری ہے اور یہ کارنامہ صرف عالم اسلام ہی انجام دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ اتنا طاقت ور ہو جائے کہ منشائے الٰہی کو بوقتِ ضرورت بزور و قوت نافذ کر سکے۔

"تنہون" کے لغوی مفہوم اور اسی کے تقاضے پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ "روکنا یا باز رکھنا" محض باتوں اور زبانی جمع خرچ ہی کا نہیں بلکہ حسبِ ضرورت کچھ زور اور قوت کا بھی مقتضی ہے۔

چنانچہ ایک حدیث شریف میں اس آیت کریمہ کی تشریح و تفصیل اس طرح ملتی ہے:

من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ، وذلک اضعف الایمان[۱۳]

تم میں سے جو کوئی کسی بری بات کو دیکھے تو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اگر اس کو اس کی طاقت نہ ہو تو پھر (کم از کم) زبان ہی سے اس فعل کی مذمت کرے اور اگر (مخالفانہ احوال کی وجہ سے) اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پھر دل میں اس چیز کو برا جانے، اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایمان کا کامل ترین درجہ یا کمال ایمان امرِ اول کی ادائیگی میں ہے، اور یہ ہر مسلمان کا آئیڈیل ہونا چاہیے کہ معاشرے میں اس کی حیثیت ایک سپاہی یا خدائی فوجدار کی سی ہو۔ جصاص رازی نہی عن المنکر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ اور اس قسم کی دیگر آیتوں کا تقاضا ہے کہ منکرات کی روک تھام میں جہاں تک ممکن ہو سکے ان کو اپنے ہاتھ (قوت و طاقت) سے بدل دینا چاہیے۔" اور اس کی تائید میں مذکورہ بالا حدیث پیش کی ہے[۱۴]

---

[۱۳] صحیح مسلم، کتاب الایمان، ۱/۶۹، دار الافتاء۔ ریاض

[۱۴] احکام القرآن، ۲/۳۰، دار الکتاب العربی، بیروت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ اصول جس طرح ہماری قومی و ملی اور معاشرتی و اجتماعی زندگی میں صحیح ہے اسی طرح ہماری سیاسی اور بین الاقوامی زندگی میں بھی صحیح ہونا چاہیے۔

اس حکم کی حکمت اور اس کی عقلی خوبیوں پر غور کیجیے کہ اس نے کس طرح منکرات کی روک تھام کے لیے مختلف مدارج و مراتب قائم کرکے امت کے ہر فرد کے ذمے اس فریضے کی ادائیگی کو ضروری قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تین مدارج میں قوی سے قوی اور ضعیف سے ضعیف تمام افراد داخل و شامل ہو جاتے ہیں اور کسی کے ذمے سے یہ فرض یا عذر ساقط نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی بھی صالح اور پاکیزہ تمدن و عمران اور ان کے صحت بخش رجحانات کے لیے ایک اصل الاصول یا بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے، اور جب تک اس اصول پر عمل نہ کیا جائے معاشرے کا سدھار نہیں ہو سکتا۔ اس عظیم اصول کی وضاحت ایک دوسرے اسلوب میں اس طرح کی گئی ہے۔

كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته

تم میں سے ہر شخص ذمے دار اور ہر شخص سے اس کی ذمے داری کے متعلق پوچھا جائے گا۔

یعنی جو بھی آدمی جس شعبے یا حلقے میں رہتا ہو اس پر اس کی حیثیت کے مطابق معروف کی ترویج و اشاعت اور منکر کی روک تھام کی ذمہ داریاں عائد رہتی ہیں، جن کو اگر وہ ادا نہ کرے تو گنہگار ہوگا۔ یہ اصول پوری اجتماعی زندگی میں لاگو ہونا چاہیے اور اس سے حکومت و سیاست بھی الگ نہیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو قوم ان سنہرے اصولوں پر صحیح معنی میں عامل و کاربند ہو جائے اس کے لیے محکمۂ پولیس کی حیثیت ایک عضو معطل کی سی رہے گی۔

"نہی عن المنکر" کا تعلق خصوصیت کے ساتھ "ظلم" سے ہے[۱۵] یعنی جہاں کہیں کوئی ظلم و زیادتی ہو رہی ہو تو ضروری ہو جاتا ہے کہ حتی المقدور اس کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ دنیا میں کوئی تمدن، کوئی عمران اور کوئی اجتماع پنپ نہیں سکتا اور یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ اگرچہ وہ بظاہر کتنا ہی خوش نما اور پائیدار کیوں نہ نظر آ رہا ہو۔ "سنت الٰہی" کے مطابق جب عذابِ الٰہی کا کوئی جھونکا آتا ہے تو پھر پائیدار سے پائیدار تمدن و عمران کی جڑیں اکھڑ جاتی ہیں اور اس کے تنکے بکھر جاتے ہیں، اور ایسے موقع پر

---

[۱۵] جیسا کہ مختلف حدیثوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی عظیم سے عظیم تر تمدن کی حیثیت شاخِ نازک پر ایک آشیانے سے زیادہ نہیں رہتی - تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے[16] کہ جو قوم "ظالم" بن جاتی ہے وہ جلد یا بدیر تہس نہس کر دی جاتی ہے اور عذابِ الٰہی بالکل دبے پاؤں آتا ہے، جس کا کسی کو احساس تک نہیں رہتا اور اس کے کوئی آثار بھی نہیں رہتے، بظاہر ہر طرح کا اطمینان رہتا ہے[17]

یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں تاکید کی گئی ہے کہ سوسائٹی میں ظلم و عدوان کو ہر حال میں روکا جائے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اس فعل سے باز رکھا جائے - ورنہ مسلسل ظلم و زیادتیوں کی بنا پر جب پاپ کا گھڑا بھر جائے گا تو اس کے نتیجے میں جو عمومی تباہی آئے گی اس کی لپیٹ میں اچھے برے سب ہی آجائیں گے اور کوئی بھی باقی نہیں بچے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنی زمین میں ظلم و عدوان سخت ناپسند ہے اور وہ کسی بھی طرح ظلم کو اپنے بندوں کے حق میں پسند نہیں کرتا۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝ (مومن ۳۱)

اور اللہ بندوں کے لیے کسی طرح کا ظلم پسند نہیں کرتا۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ظلم سے بچو۔ کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں (کا باعث) ہوگا اور حریصانہ بخل (شح) سے بچو۔ یہی حریصانہ بخل (یعنی خودغرضی) تم سے پہلے والوں کو بھی ہلاک کر چکی ہے، جس نے ان کو لوگوں کے قتل و خون ریزی پر ابھارا تو انھوں نے لوگوں کی عزت و آبرو سے کھیلا۔"[18]

ایک دوسری حدیث میں آنحضرت نے فرمایا: "قیامت کے دن حق والوں کو حق دلایا جائے گا یہاں تک کہ بے سینگ کی بکری کو سینگ والی بکری سے بھی حق دلایا جائے گا۔"[19]

---

[16] اس موقع پر علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں "الظلم مؤذن بخراب العمران" کے عنوان سے تاریخ کا جو فلسفہ سمجھایا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

[17] جیسا کہ قرآن مجید میں مختلف قوموں کی تباہی و بربادی کے ضمن میں مذکور ہے۔

[18] مسلم، باب تحریم الظلم، ۴/۱۹۹۶، مطبوعہ ریاض [19] ایضاً، ۴/۱۹۹۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں ظلم کو نہ روکنا اور ظالم کا ہاتھ نہ پکڑنا کسی قوم کی اجتماعی تباہی و بربادی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

والذی نفسی بیدہ لتامرون بالمعروف، ولتنھون عن المنکر، اولیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عقاباً منہ، ثم تدعون فلا یستجاب لکم[۲۰]

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یا تو تم معروف کا حکم کرتے رہوگے، اور منکر سے روکتے رہوگے یا پھر قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر کوئی عذاب مسلط کردے۔ پھر تم دعا کروگے تو تمہاری دعائیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

ایک دوسری حدیث میں ہے، جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں مگر اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ سب کو کسی عذاب میں مبتلا کردے۔[۲۱]

یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جہاد کی اصل غرض و غایت اور اس کی اسپرٹ کو بھی ظاہر کررہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب "معروف" کا وجود خطرے میں پڑجائے اور "منکرات" کا ظہور اور ان کا دور دورہ ہوجائے تو پھر جہاد فرض و واجب ہوجاتا ہے اور ایسے مواقع پر جہاد نہ کرنا عند اللہ جرم اور گناہ کی بات متصور ہوگی۔ جہاد فرق مراتب کے اعتبار سے ہر مسلمان پر فرض ہے، جیسے قلبی جہاد، لسانی جہاد، مالی جہاد وغیرہ۔ اور جہاد بالسیف کا نمبر تو سب سے آخر میں آتا ہے، لہٰذا منکرات و فواحش کی روک تھام حسب استطاعت ہر مسلمان کے ذمے ضروری ہے۔

---

[۲۰] ترمذی، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

[۲۱] ابو داؤد، باب الامر والنہی، ۴/۵۱۰

© rasailojaraid.com